Fikr-o-Nasar (Islamabad) 14:2 (1976)

اسلامی اقتصادیات سے متعلق

چند اصولی باتیں

محمد طاسین

زیر نظر مضمون کا مقصد کچھ ایسی اصولی باتیں عرض کرنا ہے جن کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ واضح طور پر سامنے ہوں اور انھیں پوری طرح ملحوظ رکھا جائے تو اسلام کی اقتصادی تعلیمات کو صحیح طور پر سمجھنے اور ان کی ماہیت اور افادیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اسی طرح اگر یہ باتیں اچھی طرح ذہن نشین ہوں تو ان جدید معاشی مسائل کا اسلامی حل تجویز کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے جو اس وقت مسلمان معاشروں کو ہر جگہ درپیش ہیں اور علمائے اسلام سے تقاضا کر رہے ہیں کہ وہ ان کا اسلامی حل پیش کریں۔ نیز ان اصولی باتوں کی روشنی میں ان اختلافات کا سمجھنا اور سلجھانا بھی کچھ مشکل نہیں رہتا جو اسلام کے اقتصادی اصول و ضوابط کے متعلق علماء کے درمیان پائے جاتے ہیں اور جن کی وجہ سے اسلام کا اقتصادی نظام، شدہ پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا، کا مصداق اور ایک معمّہ اور چیستان بن کر رہ گیا ہے، چنانچہ ایک غیر جانب دار شخص جب اس لٹریچر کا مطالعہ کرتا ہے جو اسلام کے اقتصادی نظام سے متعلق مختلف علماء کرام کے قلم سے متعدد کتابوں، مضمونوں اور مقالوں کی شکل میں شائع ہوا اور منظر عام پر آیا ہے تو وہ یہ دیکھ کر حیران و پریشان رہ جاتا ہے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ شدید اختلاف بلکہ کھلا تضاد پایا جاتا ہے کیونکہ ایک عالم دین جن اصول و تصورات کو اقتصاد اسلامی کے بنیادی اصول و تصورات بتلاتا ہے۔ دوسرا اپنی کتاب میں انہی اصول و تصورات کو غیر اسلامی کہہ کر ان کی تردید کرتا ہے لہذا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ حقیقت میں اسلام کے اقتصادی اصول و تصورات کیا ہیں اور یہ کہ وہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کے اقتصادی اصولوں سے

بنیادی طور پر کیسے مختلف اور افادی طور پر کیسے بہتر اور برتر ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال، اسلام اور مسلمانوں دونوں کے حق میں مضر اور نقصان دہ ہے لہٰذا شدید ضرورت ہے کہ اختلافات کو دور کر کے اسلام کے اقتصادی نظام کو ایک متعین اور قابلِ فہم شکل میں پیش کیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ ہماری نئی نسل اشتراکیت کی طرف چلی جائے اور کفر و الحاد کی راہ اختیار کرے اور ہم افسوس کرتے رہ جائیں۔

(۱) جو اصولی باتیں اس مضمون میں عرض کرنا مقصود ہیں ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلامی نظامِ حیات جن عقائد و افکار اور جن اصول و ضوابط کے مجموعے کا نام ہے وہ ان مل بے جوڑ قسم کے منتشر خیالات کی طرح نہیں بلکہ ایک کل کے اجزاء کی طرح ترتیب کے ساتھ باہمدگر مربوط و منظم ہیں۔ بالفاظ دیگر جس طرح کسی مشین کے تمام اجزاء اور پرزے، مقصدِ کل کے رشتہ میں پروئے ہوئے ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور مربوط ہوتے ہیں اسی طرح اسلام کی تمام تعلیمات بھی خواہ وہ ایمانی عقائد سے متعلق ہوں یا عبادات و اخلاق سے، معاشرت سے متعلق ہوں یا معیشت اور سیاست سے، ایک خاص مقصد کے تحت عقلی ترتیب کے ساتھ آپس میں مربوط اور منظم ہیں۔ لہٰذا جس طرح کسی کل کے متعدد اجزاء میں سے ایک جز کا صحیح مفہوم و مطلب وہ ہوتا ہے جو اس کل کے مقصدِ وجود اور باقی اجزاء سے مطابقت رکھتا ہو اسی طرح اسلامی تعلیمات میں سے کسی ایک تعلیم کا صحیح مفہوم و مطلب صرف وہ ہو سکتا ہے جو اسلام کے مقصدِ وجود اور اس کی باقی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہو اور چونکہ اسلام کی اقتصادی تعلیمات پورے اسلامی نظامِ حیات کا ایک جز ہیں لہٰذا ان کا وہی مفہوم و مطلب صحیح مفہوم و مطلب ہو سکتا ہے جو اسلامی نظامِ حیات کے مقصدِ وجود اور اس کی باقی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہو۔

مثال کے طور پر اسلام کی ایمانی تعلیمات میں اللہ تعالیٰ کی جن صفات پر ایمان لانے کی تعلیم ہے ان صفات میں سے ایک صفت ربوبیتِ عامہ ہے جو قرآنی الفاظ ربّ العالمین، ربّ الناس اور ربّ کلِّ شیءٍ سے مفہوم ہوتی ہے اور جس کا مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اندر پرورش اور نشو و نما کا جو سامان پیدا فرمایا ہے وہ سب انسانوں اور جانداروں کے لیے عام ہے لہٰذا اس سے فائدہ اٹھانے کا ہر انسان اور جاندار کے لیے موقع ہونا چاہیے۔ بعض کو سامانِ پرورش حاصل ہونا اور بعض کو نہ ہونا منشاءِ الٰہی کے خلاف ہے اور دوسری صفت رزاقیت ہمہ ہے جس کا قرآنی آیات

وَمَا مِنْ دَابَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا ۔ زمین میں جو بھی جاندار ہے اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے اور اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ ۔ بے شک اللہ ہی سب کو رزق دینے والا اور زبردست قوت والا ہے اس صفت رزاقیت عامہ کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ اللہ نے دنیا میں جو وسائل رزق پیدا فرماتے ہیں ان میں ہر جاندار اور ہر انسان کے لیے سامانِ رزق موجود ہے لہذا زمین میں جو جاندار اور انسان ہے اسے اس قدر رزق ضرور میسّر ہونا چاہیئے۔ جس پر اس کی حیات و بقا کا دار و مدار ہے اور چونکہ اسلام کی اعتقادی اور ایمانی تعلیمات، اس کی عملی تعلیمات کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اور معاشی تعلیمات چونکہ اس کی عملی تعلیمات میں سے ہیں لہذا ان کا وہی مفہوم مطلب صحیح ہوگا جو ایمانی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہو اور جس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں معاشرے کے ہر ہر فرد کو سامان پرورش اور رزق و مال مل سکتا ہو۔ اور اس کے برخلاف وہ مفہوم و مطلب صحیح نہ ہوگا جس پر کاربند ہونے سے معاشرے کے بعض افراد کو تو سامان پرورش اور رزق میسر آتا ہو اور دوسرے بعض اس سے محروم و تہی دست رہتے ہوں، یا بعض کو ترقی کے مواقع ملتے ہوں اور بعض ان سے محروم رہتے ہوں کیونکہ یہ مفہوم و مطلب اللہ کی صفت ربوبیت عامہ اور رزاقیتِ شاملہ سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اسی طرح اسلامی نظام حیات کا جو مقصد ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ نوعِ انسان کے ہر ہر فرد کو منجملہ دوسری چیزوں کے وہ معاشی سر و سامان بھی ضرور میسّر ہو جس سے اس کے معاشی تقاضوں کی تکمیل ہوتی اور اسے معاشی سکون و اطمینان ملتا ہے لہذا اسلام کی اقتصادی اور معاشی تعلیمات کا ایسا مفہوم و مطلب غلط قرار پاتا ہے جس سے بعض انسانوں کو معاشی سر و سامان ملتا اور بعض کو نہ ملتا ہو۔ اس اجمال کی کچھ تفصیل یہ کہ قرآن و حدیث کی رُو سے اسلامی نظام حیات کا مقصد انسانی فوز و فلاح ہے اخروی بھی اور دنیوی بھی۔ اخروی فوز و فلاح کا مطلب یہ کہ انسان کو آخرت میں عیشۃ راضیہ یعنی جنت کی زندگی ملے، اور دنیوی فوز و فلاح کا مطلب یہ کہ انسان کو دنیا میں حیاتِ طیبہ و حسنہ یعنی پائیدار اور مسلسل اطمینان و مسرت کی زندگی حاصل ہو جس کی ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر طلب و خواہش پائی جاتی ہے لیکن اسلام اس اطمینان و سکون کے حصول کو انسان کی دنیوی فوز و فلاح قرار نہیں دیتا جو جنگلوں اور غاروں کی تنہائی میں مجاہدوں اور ریاضتوں کے ذریعے فطری اور جبلّی تقاضوں کو

حاصل کیا جاتا ہے بلکہ اس اطمینان و سکون کو قرار دیتا ہے جو آبادیوں میں رہ کر اسباب و وسائل کے ذریعے تمام فطری، جبلی، روحانی اور عقلی تقاضوں کی تکمیل سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلام اس سکون و اطمینان کے حصول کو بھی انسانی فوز و فلاح تسلیم نہیں کرتا جو عارضی اور وقتی ہو۔ بلکہ اس سکون و اطمینان کو تسلیم کرتا ہے جو پائیدار، دائمی اور غیر محدود ہو کیونکہ ہر فرد بشر چاہتا یہی ہے کہ اسے مسلسل اور غیر محدود سکون و اطمینان ملے اور وہ ہمیشہ چین و مسرت سے رہے۔

ادھر چونکہ یہ حقیقت ہے کہ ایک انسان کو اس دنیا میں پائیدار اور مسلسل اطمینان و سکون صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے تمام روحانی و جسمانی تقاضے، صحیح توازن کے ساتھ پورے ہو رہے ہوں۔ مطلب یہ کہ اگر ایک انسان کے بعض فطری تقاضے پورے ہو رہے اور بعض پورے نہیں ہو رہے یا یہ کہ پورے تو سب تقاضے ہو رہے ہیں لیکن توازن کے ساتھ نہیں بلکہ بعض کمی اور بعض زیادتی کے ساتھ پورے ہو رہے ہوں تو ان دونوں صورتوں میں انسان کو جو سکون و اطمینان ملے گا وہ عارضی اور ناپائیدار ہوگا۔

اسی طرح یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اس دنیا میں ایک فرد کو پائیدار اور مسلسل سکون و اطمینان، اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک معاشرۂ انسانی کے ہر دوسرے فرد کو وہ سکون و اطمینان حاصل نہ ہو جائے، مطلب یہ کہ جب معاشرے کے بعض افراد کو سکون و اطمینان حاصل ہو اور دوسرے بعض بے چینی و بے اطمینانی میں مبتلا ہوں تو بعض افراد کا سکون و اطمینان پائیداری کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا بلکہ آگے چل کر وہ ضرور زائل اور ختم ہو جاتا ہے۔

لہٰذا اسلام یہ چاہتا ہے کہ معاشرۂ انسانی کے ہر ہر فرد کو وہ تمام روحانی اور مادی سر و سامان حاصل ہو جس سے اس کے روحانی و مادی تقاضے پورے ہونے اور اسے پائیدار اور مسلسل سکون و اطمینان میسر آتا ہے اور چونکہ انسان کے بعض تقاضے ایسے ہیں جو رزق و مال کے ذریعے پورے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسلام کا منشا یہ ہے کہ ہر فرد بشر کو رزق و مال بھی ضرور میسر ہو تاکہ اسے معاشی سکون و اطمینان نصیب ہو جس کے بغیر ایک انسان اپنے متعلقہ فرائض ٹھیک طریقے سے ادا نہیں کر سکتا۔

بنابریں اسلام کی معاشی تعلیمات کا وہ مفہوم و مطلب تو صحیح ہو سکتا ہے جس پر عمل کرنے سے معاشرے کے ہر ہر فرد کو سامانِ معاش اور رزق و مال میسر آتا ہو لیکن وہ مفہوم و مطلب صحیح نہیں ہو سکتا جس سے

بعض افراد کو معاشی خوشحالی اور ترقی کے مواقع ملتے اور بعض ان سے محروم رہتے ہوں۔

دوسری اصولی بات یہ کہ اسلام نے انسانی فوز و فلاح کے مذکورہ بالا مطلب کے پیشِ نظر اپنی حقیقی معاشی تعلیمات میں دو چیزیں بطور معاشی مقاصد کے سامنے رکھی ہیں ایک یہ کہ معاشرے کے ہر فرد کو ہر حال میں کم از کم اتنا سامانِ معاش ضرور میسّر ہو جس کے بغیر عام طور پر ایک انسان نہ تو صحیح معنی میں زندہ رہ سکتا ہے اور نہ اپنے متعلقہ فرائض ٹھیک طریقہ سے ادا کر سکتا ہے گو سادہ سے سادہ شکل میں اور معمولی سے معمولی معیار پر ہی لیکن ہر فردِ بشر کو کھانے پینے کے لئے غذا، پہننے کے لیے لباس، رہنے سہنے کے لیے گھر، بیماری کی حالت میں علاج معالجے اور ایک حد تک تعلیم کی سہولت ضرور میسّر ہو کیونکہ ان بنیادی ضروریات کے بغیر انسان اپنی طبعی عمر تک آسودگی کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا ــــ اور دوسری چیز یہ کہ ہر فرد کو اپنی بنیادی ضرورت سے زائد سامانِ معاش کما سکنے کا موقع حاصل ہو۔ یعنی اگر وہ ضرورت سے زیادہ سامانِ معاش کمانا چاہے تو دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر جائز اور قانونی ذرائع سے کما سکے اور اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو کیونکہ جس طرح پہلی چیز فرد کی حیات و بقا کے لیے ضروری ہے اسی طرح یہ دوسری چیز معاشرے اور اجتماع کی بقاء اور نشو و نما کے لیے ضروری ہے، مطلب یہ کہ اگر بعض افراد اپنی ضرورت سے زیادہ رزق و مال نہ کمائیں اور ایسے افراد کی معاشی ضروریات پوری نہ کریں جو اپنے لیے خود کمانے سے معذور ہوتے ہیں جیسے بچے، بوڑھے اور بیمار وغیرہ تو معاشرے کا قصہ ہی تمام ہو جائے، مثلاً ظاہر ہے کہ بچوں کی معاشی کفالت جو بڑوں کے ذمے ہوتی ہے اگر بڑوں کے پاس ضرورت سے زائد مال نہ ہو تو وہ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتے جس پر معاشرے کی بقاء کا دار و مدار ہوتا ہے علاوہ ازیں دوسرے بھی کئی جائز مقاصد ہیں جو ضرورت سے زائد مال ہی کے ذریعے پورے ہو سکتے ہیں۔ لہذا اسلام جہاں یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ معاشرے کے ہر ہر فرد کو کسی نہ کسی شکل میں بنیادی معاشی ضروریات بہر صورت میسّر ہوں وہاں یہ بھی لازمی ٹھہراتا ہے کہ ہر فرد کے لیے اس کا بھی پورا موقع ہو کہ اگر وہ اپنی ضرورت سے زیادہ سامانِ معاش اور مال و متاع کمانا چاہے تو جائز طریقوں سے کما سکے۔ کیونکہ جس معاشرے کے بعض افراد بنیادی معاشی ضروریات ہی سے محروم ہوں، یا یہ کہ بنیادی ضروریات تو سب کو میسّر ہوں البتہ ضروریات سے زیادہ کما سکنے کے مواقع صرف بعض افراد کو حاصل ہوں اور دوسرے بعض ان سے محروم ہوں تو ان دونوں صورتوں میں جلد یا بدیر ایسے حالات کا پیدا ہونا لازمی ہوتا ہے جو اس

پورے معاشرے کو بدامنی اور بے چینی میں مبتلا کر کے رکھ دیتے ہیں اور کسی فرد کو بھی وہ پائیدار اور مسلسل امن و اطمینان کی زندگی نصیب نہیں ہوتی جس کی ہر انسان کے اندر فطری طور پر طلب و خواہش پائی جاتی ہے اور جو اسلام چاہتا ہے کہ ہر فرد بشر کو حاصل ہو۔

غرضیکہ اس دوسری اصولی بات میں جو دو معاشی مقاصد بیان کئے گئے ہیں اگر یہ درست ہیں تو پھر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اسلام کی اقتصادی تعلیمات کے اس مفہوم و مطلب کو صحیح تسلیم کیا جائے جو ان مقاصد کے مطابق ہو۔ اور اس مفہوم و مطلب کو غلط سمجھا جائے جو ان مقاصد کے منافی اور مخالف ہو یعنی اس پر عمل کرنے سے معاشرے کے ہر ہر فرد کو مذکورہ بالا دو چیزیں حاصل نہ ہو سکتی ہوں۔

تیسری اصولی بات جس کا اس ضمن میں عرض کرنا ضروری ہے۔ اس حکمتِ عملی اور پالیسی سے متعلق ہے جس کے مطابق اسلام ایک بگڑے معاشرے کی اصلاح چاہتا ہے اور جس کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب معاشرے کی اصلاح فرمائی جو ہر پہلو سے ایک بگڑا ہوا اور ظالمانہ معاشرہ تھا۔ آپؐ نے تیئس سال کے عرصہ میں اس معاشرے کی تدریجاً اصلاح فرمائی اور درجہ بدرجہ ہر قسم کے ظلم و فساد کو دور کر کے اس کی جگہ عدل و انصاف قائم فرمایا اور اس سلسلہ میں آپؐ نے جس حکمتِ عملی کو پوری طرح ملحوظ اور مدِ نظر رکھا وہ یہ کہ اصلاح میں خواہ کتنا ہی زیادہ وقت کیوں نہ لگ جائے لیکن جتنی اصلاح وجود میں آئے وہ مستقل اور پائیدار ہو عارضی اور ناپائیدار نہ ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ کچھ وقت گذرنے کے بعد وہ صلاح، فساد سے بدل جائے اور اس سے جو فائدہ حاصل ہوا تھا وہ زیادہ ضرر کی شکل اختیار کر لے بالفاظ دیگر اصلاح کے سلسلہ میں جو قدم اٹھایا جائے وہ منزلِ مقصود کی طرف بڑھے اس سے پیچھے نہ ہٹے اگرچہ رفتار دھیمی اور سست ہو اور اس کے لیے آپؐ نے جو حکیمانہ طریق کار اختیار فرمایا وہ یہ کہ ہر اصلاحی اقدام اور عملی تبدیلی سے پہلے آپؐ نے اس کے لیے موافق ذہنی و خارجی ماحول تیار کیا یعنی ایک طرف تعلیم و تربیت کے ذریعے ذہنوں کو اس قابل بنایا کہ وہ ہونے والی تبدیلی کو بخوشی قبول کر سکیں اور ان پر وہ تبدیلی شاق نہ گذرے۔ اور دوسری طرف خارج سے وہ مادی اسباب و محرکات دور کئے جو اس عملی تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے تھے اور جن کے ہوتے ہوئے وہ اصلاحی اقدام موثر اور مفید ثابت نہیں ہو سکتا تھا اور یہ طریق کار اس بنا پر اختیار فرمایا گیا کہ یہ واقعہ ہے کہ جب کسی اصلاحی تبدیلی کے لیے موافق ذہنی اور خارجی ماحول موجود نہ ہو تو اس کا ایسا ردِ عمل ظاہر ہونا ضروری

ہوتا ہے جس سے حاصل شدہ صلاح، فساد سے بدل جاتی اور فائدہ ضرر کی شکل اختیار کر لیتا ہے گویا سب کئے کرائے پر پانی پھر جاتا اور ساری کوشش رائیگاں جاتی ہے اور نتیجہ زیاں و خسران کی صورت میں نکلتا ہے۔

چونکہ اس عرب معاشرے میں دوسرے ہر قسم کے ظلم و فساد کے ساتھ معاشی ظلم و فساد بھی پایا جاتا تھا لہذا اسی حکمت عملی کے تحت اور اسی طریق کار سے اس کو بتدریج دور کر کے معاشی پہلو کی اصلاح فرمائی گئی۔ ہر تبدیلی سے پہلے اس کے لیے مناسب اور سازگار ذہنی و خارجی ماحول پیدا کیا گیا اور پھر وہ تبدیلی عمل میں لائی گئی، مثلاً اس معاشرے میں معاملہ ربوٰ اپنی مختلف شکلوں میں رائج تھا جو ظلم و حق تلفی پر مبنی ہونے کی وجہ سے روز اوّل سے حرام تھا اور سابقہ کتب سماویہ میں اس کی واضح ممانعت موجود تھی، لیکن جب تک وہ خاص طرح کے ذہنی و خارجی حالات پیدا نہ ہو گئے جو اس کی قانونی ممانعت کے لیے ضروری تھے مسلمانوں کو اس سے منع نہ کیا گیا۔ مدینہ میں مسلمان کافی عرصہ تک یہود سے سودی لین دین کرتے رہے تاآنکہ ۹ھ میں اس کی تحریم اور قانونی ممانعت کا اعلان ہوا اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ہر شکل کو ممنوع اور ناجائز ٹھہرایا اور مسلمانوں کو اس سے سختی کے ساتھ روکا گیا، یعنی یہ اس وقت ہوا جب ایک طرف عام طور پر ذہنوں میں ظلم و حق تلفی سے نفرت اور عدل سے محبت، باہمی تعاون و ہمدردی، انفاق فی سبیل اللہ اور قرض حسنہ وغیرہ کا جذبہ طاقت پکڑ گیا اور دوسری طرف مسلمان سیاسی طور پر آزاد و خود مختار اور معاشی لحاظ سے خود کفیل ہو گئے یعنی اس قابل بن گئے کہ اب اپنی مرضی سے غیر مسلموں کے ساتھ معاشی معاملات اور تعلقات قائم رکھیں جبکہ پہلے ان کی مرضی کے مطابق ان کے ساتھ معاشی تعلقات قائم رکھنے پر مجبور تھے۔ بالفاظ دیگر اب انہیں اس کا ڈر اور اندیشہ نہ رہا کہ اگر غیر مسلموں سے ان کے معاشی تعلقات منقطع ہو گئے تو اس سے ان کے جماعتی وجود اور نصب العین کو نقصان پہنچے گا جبکہ پہلے اس کا ڈر اور اندیشہ موجود تھا۔

اور پھر ربا کو ممنوع قرار دینے میں اس ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا کہ اس کی جو شکل ظالمانہ تھی جیسے "اضعافاً مضاعفۃ" والی شکل، اسے پہلے اور پھر آگے چل کر اس کی ہر شکل کو علی الاطلاق ممنوع ٹھہرایا گیا، اسی طرح مزارعت اور کراء الارض کی جو شکلیں زیادہ بُری تھیں پہلے انھیں اور پھر اس کی ہر شکل کو ممنوع قرار دیا گیا۔

غرضیکہ یہ جو تیسری اصولی بات اسلامی حکمت عملی اور طریقِ کار کے متعلق عرض کی گئی ہے اس سے ایک تو اس اختلاف کی حقیقت بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے جو قرآن و حدیث میں ذکر شدہ اقتصادی تعلیمات کے درمیان پایا جاتا ہے یعنی یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ ان مختلف تعلیمات کا تعلق مختلف حالات سے ہے لہٰذا ان کے درمیان جو اختلاف ہے وہ حقیقی نہیں بلکہ ظاہری ہے باعث تعارض نہیں بلکہ باعث توافق ہے، اور دوسرا اس سے مقصود یہ بتلانا ہے کہ آج بھی معاشرے کی معاشی اصلاح کی صحیح صورت وہی ہو سکتی ہے جو مذکورہ حکمت عملی اور طریقِ کار کے مطابق ہو، یعنی اصلاح حال کے لیے کوئی قانون نافذ کرنے سے پہلے اس کے لیے ایک طرف افہام و تفہیم کے ذریعے ذہنوں کو تیار کیا جائے اور دوسری طرف باہر کے ان مادی محرکات کو دور کیا جائے جو ظلم و فساد کو سہارا دیتے ہیں تاکہ جو صلاح و درستگی وجود میں آئے وہ مستقل اور پائیدار ہو عارضی اور ناپائیدار نہ ہو۔

چوتھی اصولی بات جس کا اس بارے میں ذکر نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ قرآن مجید اور حدیث نبویؐ میں حیاتِ انسانی کے معاشی پہلو سے متعلق جو اقتصادی تعلیمات ہیں وہ تین قسم کی ہیں: ایک وہ جن کی نوعیت اخلاقی مواعظ اور نفلی احکام کی سی ہے، دوسری وہ جن کی حیثیت حقیقی قوانین اور فرض احکام کی طرح ہے اور تیسری وہ جن کی نوعیت عبوری قوانین اور وقتی احکامات کے مانند ہے لہٰذا ان تین قسم کی تعلیمات کے درمیان کئی وجوہ سے فرق و اختلاف ہے جس کی کچھ تفصیل یہ ہے:

۱- فرق و اختلاف کی پہلی وجہ جو ان تین قسم کی اقتصادی تعلیمات کے درمیان پائی جاتی ہے وہ یہ کہ اوّل الذکر تعلیمات کی بنیاد دراصل احسان و ایثار پر ہے جس کے معنے ہیں، ہمدردی اور خیر خواہی کے طور پر اپنا حق تبرعاً دوسرے کو دے دینا، بالفاظ دیگر بغیر کسی قانونی استحقاق کے اپنی چیز محض ہمدردی کے طور پر دوسرے کو دے دینا اور دوسرے کی خاطر اپنے حق سے بخوشی دستبردار ہو جانا۔

ثانی الذکر تعلیمات کی بنیاد عدل و انصاف پر ہے جس کا مطلب ہے ہر حقدار کو اس کا واجبی حق پورا پورا اور ٹھیک ٹھاک ملنا۔ اور تیسری قسم کی تعلیمات کی بنیاد وقتی مصلحت پر ہے جس کا مطلب ہے: ناموافق حالات میں اسے اختیار کرنا جو نسبتاً بہتر ہو اور جسے اختیار کرنے سے ظلم و فساد میں کچھ نہ کچھ کمی اور خیر و صلاح میں کچھ زیادتی ہوتی ہو۔

۲- فرق و مغائرت کی دوسری وجہ، ان تین قسم کی اقتصادی تعلیمات کے مابین یہ ہے کہ پہلی قسم

کی تعلیمات جو احسان پر مبنی اور اخلاقی ترغیبات کا درجہ رکھتی ہیں جبری نہیں اختیاری ہیں یعنی ان پر عمل کرنے نہ کرنے کے معاملہ میں افراد آزاد ہیں، چاہیں تو اپنی مرضی سے ان پر عمل کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ حکومت یا حکومت کی طرح کے کسی ادارے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ طاقت کے ذریعے بجبر اس قسم کی تعلیمات پر عمل کرائے اور عمل نہ کرنے والوں کو سزا دے کیونکہ ان تعلیمات پر عمل نہ کرنے سے کسی کی حق تلفی واقع نہیں ہوتی اور معاشرے کا اجتماعی توازن نہیں بگڑتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان پر عمل کرنے سے معاشرتی تعلقات زیادہ خوشگوار ہوتے اور اجتماعی امن و سکون میں اضافہ ہوتا ہے لہذا حکومت، شہریوں سے اس قسم کی تعلیمات پر عمل کرنے کی اپیل کر سکتی اور ترغیب دے سکتی ہے اور جو لوگ اس قسم کی تعلیمات پر عمل کریں مختلف طریقوں سے ان کی حوصلہ افزائی کر سکتی ہے۔ مثلاً ایسے لوگوں کو خصوصی مراعات اور قومی اعزازات سے نواز کر ان کا معاشرتی درجہ بلند کر سکتی ہے بلکہ ایسا کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔

ان پہلی قسم کی تعلیمات کے برعکس دوسری قسم کی اقتصادی تعلیمات جو حقیقی قوانین کا درجہ رکھتی ہیں اختیاری نہیں بلکہ جبری ہیں۔ افراد پابند اور مجبور ہیں کہ ان پر عمل کریں اور ان کی خلاف ورزی سے بچیں۔ کیونکہ ان پر عمل کرنے سے افراد کے معاشی حقوق ٹھیک ٹھیک محفوظ ہوتے اور ان کی خلاف ورزی سے ضائع اور تلف ہوتے ہیں اور معاشرے کا معاشی توازن بگڑ کر رہ جاتا اور امن عام میں خلل پڑتا ہے لہذا حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ وہ شہریوں کو ان تعلیمات کی پابندی پر مجبور کرے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے کیونکہ حکومت کے وجود کا اصل مقصد شہریوں کے ہر قسم کے حقوق کا تحفظ اور عدل کا قیام ہے۔

اسی طرح تیسری قسم کی عبوری تعلیمات بھی اپنے وقت پر جبری ہیں اور ان پر عمل کرانا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے اس لیے کہ ان پر عمل کرنے سے اس ظلم و فساد میں کچھ کمی واقع ہوتی ہے جو معاشرے میں پہلے سے موجود ہوتا ہے اور جسے ختم یا کم کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے لہذا حکومت طاقت اور جبر کے ذریعے ان پر عمل کرا سکتی ہے۔

۳۔ فرق و اختلاف کی تیسری وجہ ان تعلیمات کے درمیان یہ ہے کہ پہلی قسم کی اخلاقی تعلیمات پر عمل درآمد سے ایک طرف عمل کرنے والوں کو اخلاقی رفعت، روحانی عظمت اور اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے وہ دنیا میں عزت و تکریم اور آخرت میں خصوصی اجر و ثواب کے مستحق قرار پاتے ہیں،

دوسری طرف حسنِ سلوک سے دلوں میں ایک دوسرے سے محبت و الفت پیدا ہوتی، معاشرتی تعلقات زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنتے اور اجتماعی امن و اطمینان میں اضافہ ہوتا ہے۔ بشرطیکہ دوسری قسم کی قانونی تعلیمات پر پوری طرح عمل ہو رہا ہو۔ مطلب یہ کہ جو شخص ہر دوسرے آدمی کے ساتھ عدل نہ کر رہا ہو بلکہ بعض لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ ظالمانہ اور ان کی حق تلفی کا مرتکب ہو وہ اگر دوسرے بعض انسانوں پر احسان کرتا ہے تو اس کو مذکورہ فائدے حاصل نہیں ہوتے۔ اسی طرح جو معاشرہ قوانین عدل پر عمل پیرا نہیں ہوتا اس میں اگر بعض افراد احسانی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں تو اس سے معاشرے کے اجتماعی حالات پر کچھ خاص اثر نہیں پڑتا۔ اور وہ ان فائدوں سے محروم رہتا ہے جو قوانینِ عدل پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں ضرور رونما ہوتے ہیں۔

دوسری قسم کی تعلیمات جو مستقل اور حقیقی قوانین کی حیثیت رکھتی ہیں ان پر عمل کرنے کے نتیجہ میں ہر فرد کے معاشی حقوق ٹھیک ٹھیک محفوظ ہو جاتے اور معاشرے میں معاشی اعتدال و توازن پیدا ہوتا اور ہر شخص کو ضرورت کی حد تک معاشی خوشحالی ملتی ہے اور تیسری قسم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے سے اس معاشی ظلم و فساد میں کچھ کمی واقع ہو جاتی ہے جو پہلے سے معاشرے میں موجود رہتا ہے اور حالات نسبتہً بہتر ہو جاتے ہیں۔

۴۔ عملی ترتیب کے لحاظ سے بھی ان تین قسم کی اقتصادی تعلیمات کے مابین فرق ہے وہ اس طرح کہ تیسری قسم کی تعلیمات جو بمنزلہ عبوری احکام کے ہیں عملی ترتیب میں وہ قانونی اور اخلاقی تعلیمات پر مقدم ہیں۔ ان کے بعد قانونی تعلیمات اور آخر میں اخلاقی قسم کی تعلیمات کا نمبر آتا ہے کیونکہ جو فرد یا معاشرہ اپنے خاص ذہنی و خارجی حالات کی وجہ سے سو فیصد ظلم و حق تلفی میں مبتلا ہو اور تاوقتیکہ اس کے حالات درست ہو جائیں وہ ظلم و حق تلفی کو یکسر نہ چھوڑ سکتا ہو اس کی اصلاح کا عقلی طور پر صحیح طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف اس کے حالات درست کرنے کی کوشش کی جائے اور جس رفتار سے حالات درست ہوتے جائیں اسی رفتار سے ظلم و حق تلفی میں بتدریج کمی کی جاتی رہے یعنی اس سے ظلم و حق تلفی کی مقدار میں کمی کا مطالبہ کیا جائے، اور جب حالات، عدل کامل کے موافق اور سازگار ہو جائیں تو پھر اس سے عدل کامل کا مطالبہ کیا جائے اور جب عدل کامل پر کاربند ہو جائے تو پھر اس کو احسان کی ترغیب دی جائے۔ اس لیے جو ظلم کو جزوی طور پر چھوڑنے کے

لیے تیار نہ ہو اس سے عدل کامل کا مطالبہ، اور جو عدل کامل کے لیے تیار نہ ہو اسے احسان کی ترغیب دینا لاحاصل ہے لہٰذا جن اقتصادی تعلیمات کا تعلق ظلم میں کمی سے ہے وہ عمل میں پہلے اور جن کا عدل سے ہے وہ ان کے بعد اور جن کا احسان و ایثار سے ہے وہ آخر میں ہیں۔ بنابریں بلحاظ عمل عبوری اقتصادی تعلیمات کا نمبر پہلے، حقیقی قانونی تعلیمات کا نمبر ان کے بعد اور اخلاقی اقتصادی تعلیمات کا نمبر آخر میں آتا ہے قرآن حکیم کی آیت اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ میں پہلے عدل کا اور پھر احسان کا حکم ہے۔ جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ عدل پہلے اور احسان بعد میں ہے۔

۵۔ فرق و اختلاف کی پانچویں وجہ ان تین قسم کی اقتصادی تعلیمات میں بلحاظ تعیّن اور عدم تعیّن کے ہے مطلب یہ کہ ان میں سے جو حقیقی قانونی تعلیمات ہیں وہ چونکہ عدل پر مبنی ہیں جس میں پورے حق کا تصوّر ہوتا ہے اور چونکہ پُورے حق کی ایک ہی متعین شکل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ان تعلیمات کی بھی ایک ہی متعین شکل ہے اور اخلاقی قسم کی اقتصادی تعلیمات چونکہ احسان پر مبنی ہیں جس کی کمی بیشی کے لحاظ سے بے شمار شکلیں ہوتی اور ہو سکتی ہیں لہٰذا ان تعلیمات کی بھی بے شمار شکلیں بنتی ہیں۔ اسی طرح عبوری تعلیمات کی بنیاد چونکہ اس تصوّر پر قائم ہوتی ہے کہ ظلم کی مقدار میں کمی ہو اور چونکہ ظلم میں کمی کی بکثرت شکلیں ہو سکتی ہیں لہٰذا ان تعلیمات کی بکثرت شکلیں ہونا ایک قدرتی امر ہے اس کی وضاحت کے لیے ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ایک مزدور کام کرتا ہے اور اس کے بدلے اس کی اُجرت مثلاً دس روپے قرار پائی ہے اب اگر متاجر اس کو پورے دس روپے ادا کرتا ہے تو یہ عدل ہے اور چونکہ پورے دس کی ایک ہی متعین شکل ہے لہٰذا عدل کی بھی ایک ہی متعین شکل ہوئی اس کی دو شکلیں نہیں ہو سکتیں اور اگر متاجر کچھ نہیں دیتا یا دس روپے سے کم دیتا ہے تو یہ ظلم ہے جس کی اس مثال میں نوسو ننانوے شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً دس روپے سے ایک پیسہ کم دینا بھی ظلم۔ نوسو ننانوے پیسے کم دینا بھی ظلم، ایک روپیہ کم دینا بھی ظلم اور پورے دس روپے نہ دینا بھی ظلم، اور اگر متاجر اس کو دس روپے سے زائد دیتا ہے تو یہ احسان ہے اور چونکہ دس روپے سے زائد دینے کی بے شمار اور کثیر التعداد شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک پیسہ زیادہ دینا ایک روپیہ زیادہ دینا، دس روپے زیادہ دینا، سو روپے زیادہ دینا اور ہزار اور لاکھ روپے زیادہ دینا وغیرہ لہٰذا احسان کی بے شمار شکلیں ہونا ایک قابل فہم بات ہے اس مثال سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ عدل کی صرف ایک ہی متعین شکل ہے اور احسان

اور ظلم کی غیر متعین کثیر التعداد شکلیں ہیں وہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ عدل دراصل ظلم اور احسان کے درمیان حد فاصل اور مابہ الامتیاز ہے گویا عدل وہ درمیانی نقطہ ہے جس کے ایک طرف کے خط کا نام ظلم اور دوسری طرف کے خط کا نام احسان ہے اور جس طرح برابری کے تعین کے بغیر زیادتی اور کمی کا تعین نہیں ہو سکتا اسی طرح عدل کے تعین کے بغیر احسان اور ظلم کا تعین نہیں ہو سکتا۔

چھٹی وجہ فرق و اختلاف کی ان تینوں قسم کی تعلیمات کے مابین یہ ہے کہ ان میں پہلی اور تیسری قسم کی جو تعلیمات ہیں ان کی بنا پر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کا اقتصادی نظام اشتراکیت اور سرمایہ داری وغیرہ کے اقتصادی نظاموں سے بہتر اور افضل ہے البتہ دوسری قسم کی تعلیمات کی بنا پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا اور آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے اس اجمال کی کچھ تفصیل یہ کہ پہلی قسم کی تعلیمات جن میں احسان اور ایثار کی ترغیب ہے اسلام سے مختص نہیں کیونکہ دنیا کے ہر مذہب و دین میں ایسی تعلیمات موجود ہیں جن میں احسان و ایثار کی ترغیب ہے اشتراکی ہوں یا سرمایہ دار، الہامی مذاہب کے ماننے والے ہوں یا ان کے منکر سب ہی اس چیز کو اچھا سمجھتے اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ انسان ہمدردی و خیر خواہی کے جذبہ سے دوسروں پر زیادہ سے زیادہ احسان کرے اور فیاضی و دریا دلی سے پیش آئے لہذا اس قسم کی اقتصادی تعلیمات کی بنا پر جو احسان کی ترجمان ہیں، اسلام کی امتیازی عظمت و برتری دوسرے ادیان و مذاہب پر ثابت نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح جو تیسری قسم کی عبوری اقتصادی تعلیمات ہیں وہ جس اصول پر مبنی ہیں وہ اصول بھی اسلام کے ساتھ مختص نہیں بلکہ تمام ادیان اور نظاموں میں پایا جاتا ہے اور سب اس کو صحیح سمجھتے اور اس سے کام لیتے ہیں یعنی جب ناموافق حالات کی وجہ سے پوری خیر و بھلائی ممکن نہ ہو تو جتنی ممکن ہو اسے اختیار کر لیا جائے اور پوری کے لیے کوشش جاری رکھی جائے یہ ایک ایسا عقلی اصول ہے جس کو سب صحیح مانتے اور کسی نہ کسی شکل میں اس پر عمل بھی ضرور کرتے ہیں لہذا اس اصول پر مبنی اسلام کی جو اقتصادی تعلیمات ہو سکتی ہیں ان کی بنا پر بھی اسلامی نظام کی غیر اسلامی نظاموں پر برتری ثابت نہیں کی جا سکتی۔ البتہ دوسری قسم کی جو حقیقی قانونی تعلیمات ہیں ان کی بنا پر اسلامی نظام کی غیر اسلامی نظاموں پر برتری ضرور ثابت کی جا سکتی ہے اس لیے کہ یہ تعلیمات، معاشی عدل کے جس تصور پر مبنی ہیں وہ معاشی عدل کے ان تصورات سے یقیناً بہتر ہے جن پر اشتراکیت اور سرمایہ داری وغیرہ کے معاشی نظام مبنی ہیں اور معاشی عدل کا

جو اسلامی تصور ہے اس میں ہر فرد معاشرہ کے لیے دو چیزوں کی ضمانت ہے ایک اس چیز کی کہ کوئی انسان کسی حال میں بھی بقدر ضرورت سامانِ معاش سے محروم نہ رہے اور دوسری اس بات کی کہ ہر ایک کے لیے قدر ضرورت سے زیادہ مال متاع کما سکنے کا موقع ہو یعنی اس کی رُو سے ہر فرد کو بقدر ضرورت سامان معاش کما سکنے کا موقعہ بھی ملتا ہے جبکہ معاشی عدل کے سرمایہ دارانہ تصور میں مذکورہ دونوں چیزوں کی عقلی ضمانت نہیں پائی جاتی اور اشتراکی تصور میں پہلی چیز کی تو کچھ ضمانت تو موجود ہے لیکن دوسری چیز کی کوئی ضمانت نہیں۔ اسی طرح معاشی عدل کا اسلامی تصور انسانی فطرت سے پوری مطابقت رکھتا ہے اس کی رُو سے فرد کی انفرادی آزادی بھی قائم اور محفوظ رہتی ہے اور اسے معاشی خوشحالی بھی حاصل رہتی ہے۔ جبکہ یہ بات معاشی عدل کے غیر اسلامی تصورات میں پوری طرح نہیں پائی جاتی بلکہ ادھوری اور ناقص پائی جاتی ہے۔

قرآن و حدیث میں یہ جو تین قسم کی اقتصادی تعلیمات ہیں ان میں سے بطور مثال کچھ عرض کرتا ہوں تاکہ حقیقت حال اچھی طرح واضح ہو جائے۔

پہلی قسم کی اقتصادی تعلیمات کی مثال قرآن حکیم کی وہ آیات ہیں جن میں انفاق مطلق اور صدقات نافلہ کی ہدایت اور ترغیب ہے۔ مثلاً:-

۱: يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۵ قُلِ الْعَفْوَ ۵ (البقرہ ۲۱۹)	آپ سے پوچھتے ہیں کہ راہ خدا میں کیا خرچ کریں کہہ دیجئے جو بھی ضرورت سے زائد ہو۔
۲- اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۵ (البقرہ ۲۷۴)	وہ لوگ جو اپنے مال خرچ کرتے ہیں مصارف خیر میں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑا اجر ہے اور نہ انہیں کوئی خوف و ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین و پریشان ہوں گے۔
۳- مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۵	ان لوگوں کا حال جو اپنے مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اس دانے کا سا ہے جس نے اگائیں سات بالیں، ہر بال میں ایک سو دانے، اور اللہ مزید بڑھاتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور اللہ وسعت والا

(البقرہ ۲۶۱) اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

۴۔ قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً ۔ (ابراہیم ۳۱)

اے پیغمبر! میرے بندوں سے کہہ دیجئے جو ایمان لائے، نماز قائم کریں اور خرچ کریں اس میں سے جو ہم نے ان کو دیا، پوشیدہ طور پر اور کھلے طور پر،

۵۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۵ (الانفال ۶۰)

اور تم جو شے بھی اللہ کی راہ میں خرچ کروگے وہ تمہیں پوری پوری دے گا اور تم سے کوئی بے انصافی نہ ہوگی۔

۶۔ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۵ (البقرۃ ۲۷۱)

اگر تم صدقات ظاہری طور پر دو تو یہ اچھا ہے۔ اور اگر پوشیدہ طور پر فقراء کو دو تو وہ تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے۔

۷۔ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۵ (الحدید ۱۸)

بے شک صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، اور جو قرض دیتے ہیں اللہ کو قرض حسن، اللہ ان کے دیے کو ان کے لیے چند در چند بڑھاتا ہے اور ان کے لیے عظیم اجر ہے۔

۸۔ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۵ (الحشر ۹)

اور جو دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ ان کو خود شدید ضرورت ہی کیوں نہ ہو۔ اور جس نے خود کو بخل یا شدید حرص سے بچا لیا پس ایسے ہی لوگ فلاح و کامیابی پانے والے ہیں۔

قرآن حکیم کی ان مذکورہ آیات میں جن انفاق، صدقے اور ایثار کی تعلیم و ترغیب ہے وہ محدود اور موقت نہیں بلکہ مطلق اور عام ہے۔ نیز تعلیم کا اسلوب قانونی اور وجوبی نہیں بلکہ ترغیبی اور استحبابی ہے اس پر دلیل یہ کہ عمل پر اجر و ثواب کا وعدہ اور بشارت ہے لیکن ترک عمل پر سزا اور عذاب کی وعید اور دھمکی نہیں۔

احادیث نبویہ میں ان دونوں قسم کی اقتصادی تعلیمات کی مثال ایک تو وہ احادیث ہیں جن پر زائد

ازضرورت مال راہِ خدا اور مصارفِ خیر میں خرچ کر دینے کی ترغیب ہے جیسے۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وَسَلَّمَ قَالَ : ابن آدم انك ان تبذل الفضل خیر لك وان تمسکہ شرٌّ لك ۔ (ص ۱۲۶ ۔ ج ۷ ۔ صحیح المسلم)

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے ۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اے آدم کے بیٹے ! یقین کر کہ تیرا اپنی ضرورت سے زائد مال کو ضرورت مندوں پر خرچ کر دینا تیرے لیے خیر اور بہتر ہے اور اسے روک رکھنا تیرے لیے شر اور بُرا ہے۔

عَنْ قَتَادَۃَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللّٰہِ علیہ وسلم قال اُوحی الیّ کلماتٍ دَخَلْنَ فِی اُذُنِی وَقَرْنَ فی قلبی اُمرت ان لا استغفر لمن مات مشرکا۔ ومن اعطی فضل مالہ فھو خیرٌ لہ ومن امسك فھو شر لہ ولا یلوم اللّٰہ علی کفاف (ص ۲۶۹ ۔ ج ۳ ، کنز الاعمال)

حضرت قتادہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : میری طرف چند کلمات وحی کیے گئے جو میرے کان میں داخل ہو کر دل میں ٹھہر گئے، ایک یہ کہ میں اس کے لیے مغفرت نہ چاہوں جو شرک کرتے مرا ہو اور دوسری بات یہ کہ میں کہہ دوں کہ جس نے اپنا زائد از ضرورت مال ضرورت مندوں کو دے دیا وہ اس کے لیے بہتر ہے اور جس نے روک رکھا وہ اس کے لیے بُرا ہے اور یہ کہ بقدر کفاف رکھنے پر اللہ ملامت نہیں کرتا۔

عن کدیر الضبیؓ ان رجلا اعرابیًا آتی النبی صلی اللّٰہ علیہِ وسلّم فقال اخبرنی بعمل یقربنی من الجنۃ ویباعدنی من النار۔ فقال النبیؐ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: تقول العدل وتعطی الفضل۔ (ص ۱۹۴ ۔ ج ۲ ۔ الترغیب والترھیب)

حضرت کدیر الضبیؓ سے مروی ہے کہ ایک اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا۔ حضور مجھے کوئی ایسا عمل بتلائیں جو مجھے جنت کے قریب اور دوزخ سے دور کر دے آپؐ نے جواب میں فرمایا۔ وہ عمل یہ کہ تم ہمیشہ عدل و انصاف کی بات کرو اور ضرورت سے زائد مال، دوسرے ضرورت مندوں کو دے دو

(جاری)